



حرف آغاز

جہاد کے احکام

سید جلال الدین عمری

جہاد کے بعض احکام کا اس سے قبل ذکر آچکا ہے۔^۱ یہاں مزید دو احکام کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ ایک کا تعلق فرد سے ہے اور دوسرے کا ریاست سے۔ کسی فرد کو جہاد پر نکلنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے ذمے کسی کا حق تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے اس کی فکر کرنی ہوگی۔ اسے نظر انداز کر کے جہاد کے لئے کھڑا ہو جانا صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے ہدایت کی ہے کہ جہاد میں شرکت سے کسی کا حق ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ اگر اس کا قوی اندیشہ ہو تو جہاد میں شرکت درست نہیں ہے۔

شہادت سے قرض معاف نہیں ہوتا

صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے اللہ کے راستے میں خلوص کے ساتھ جان دی ہے تو اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، لیکن قرض اس کے ذمہ ہے تو معاف نہ ہوگا۔ حضرت ابو قتادہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور (خطبہ) ارشاد فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ تمام اعمال میں افضل ہیں۔ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر میں اللہ کے راستے

۱۔ ملاحظہ ہو سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۲ء

میں جان دے دوں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا:
 نعم ان قتلت فی سبیل اللہ و انت صابر، مارے گئے کہ میدان میں پامردی کے
 محتسب، مقبل، غیر مدبر ساتھ جئے رہے، اللہ سے اجر و ثواب کی
 توقع وابستہ رکھی، تمہاری پیش قدمی جاری رہی، اور تم نے پیٹھ نہ دکھائی (تو
 اللہ تعالیٰ تمہارے تمام قصور معاف کر دے گا۔)

تھوڑی دیر بعد آپؐ نے اس سے کہا کہ اپنا سوال پھر دہراؤ۔ اس نے
 دوبارہ یہی سوال کیا۔ آپؐ نے وہی جواب دیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:
 إلا الدین، فان جبریل علیہ السلام قال لی معاف نہیں ہوگا۔ جبریل نے مجھے اس
 ذالک لے کے بارے میں بتایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 یغفر للشہید کل ذنب إلا شہید کا ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے
 سوائے قرض کے۔

الدين ۲ اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آتی ہے کہ

۱۔ مسلم: کتاب الامارۃ، باب من قتل فی سبیل اللہ کفر خطایہ الا الدین۔ بعض روایات
 میں تفصیلات میں کسی قدر فرق ہے، ملاحظہ ہو۔ نسائی: کتاب الجہاد، باب من قتل فی
 سبیل اللہ و علیہ دین۔

۲۔ مسلم: حوالہ سابق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

القتل فی سبیل اللہ
یکفر کل خطیئة فقال
جبریل: الا الدین، فقال
النبی صلی اللہ علیہ
وسلم: إلا الدین۔ ۱
اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دینا (وہ
عمل ہے جو) ہر گناہ کو معاف کر دیتا
ہے۔ اس پر حضرت جبریل نے آپ
سے کہا: سوائے قرض کے، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا: سوائے
قرض کے۔

مطلب یہ ہے کہ جہاد میں پورے خلوص اور استقامت کے ساتھ
شرکت ہو اور اس کے تقاضے پورے کیے جائیں، تو سارے گناہ معاف ہو سکتے
ہیں، لیکن قرض معاف نہیں ہوگا۔ اگر وہ ادا نہ ہوا تو اس کی ضرورت پڑے گی۔
علامہ شوکانی اس موضوع سے متعلق احادیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ
ان میں اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد سے تمام گناہ اور قصور معاف ہو جاتے ہیں
بشرطے کہ وہ اللہ کے راستے میں ہو، اس سے اجر و ثواب کی طلب پیش نظر رہے
اور آدمی محاذ جنگ پر پسپائی نہ اختیار کرے۔ شہید مغفرت عامہ کا مستحق ہوتا ہے۔
البتہ اس سے 'دیون لازمہ' (یعنی ایسے قرض جن کی ادائیگی لازم ہے) معاف
نہیں ہوں گے۔ یہ شہادت کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ ان کا تعلق
انسانوں کے حقوق سے ہے۔ یہ اُسی وقت ساقط ہوں گے۔ جب کہ متعلقہ شخص
اپنی مرضی، خوشی اور اختیار سے انہیں ساقط کر دے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی نماز جنازہ نہیں ادا کی جس پر قرض تھا۔ ۲

۱۔ ترمذی: کتاب فضل الجہاد، باب ما جاء فی ثواب الشہداء

۲۔ نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۱-۲۵۲، مطبع مصطفیٰ البابی الجلی۔ مصر ۱۹۷۱ء

سوال یہ ہے کہ اگر قرض دار جہاد میں شریک ہونا چاہے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ اگر اس نے ادائیگی کا نظم کر دیا ہو، یا کوئی اس کی طرف سے ادائیگی کی ضمانت لے لے تو وہ جہاد پر جاسکتا ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ دائن (قرض دینے والا) کی اجازت سے وہ جہاد پر جاسکتا ہے، اگر وہ اجازت نہ دے تو نہ جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرض فوری طور پر واجب الادا ہو تو دائن کی اجازت ہونی چاہئے، ورنہ اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی قانونی حیثیت بیان کرتے ہوئے قاضی شوکانی کہتے ہیں:

”اس سلسلے کی احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شہید کے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے، سوائے قرض کے اگر وہ ادا ہونے سے رہ جائے۔ اس سے یہ استدلال صحیح نہ ہوگا کہ جب تک دائن کی اجازت نہ ہو، آدمی جہاد پر نہیں جاسکتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے گا کہ اگر آدمی یہ چاہے کہ اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں تو اسے دائن سے اجازت لینی چاہئے۔ اگر وہ سوچے کہ ایک گناہ کی مغفرت نہ ہونے کے باوجود عمومی ثواب کی خاطر اسے جہاد پر جانا چاہئے تو وہ جاسکتا ہے۔ یہ اس کے لئے جائز ہوگا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ اسے قرض فوری طور پر ادا کرنا ہو۔ لیکن اگر اس میں تاخیر کی گنجائش ہو تو اس میں دورائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس صورت میں بھی دائن (قرض دینے والا) سے اجازت لینی چاہئے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اسے دائن سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی حیثیت سفر تجارت کی سی ہے۔ (جب وہ تجارت کے لئے سفر کر سکتا ہے تو جہاد کے لئے بھی کر سکتا ہے)۔“

حدیث میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی نے قرض لے

رکھا ہے، اسے اس نے ادا نہیں کیا، یا اس کے ادا کرنے کا اس کا ارادہ نہیں ہے تو راہِ خدا میں جان دینے کے باوجود وہ معاف نہیں ہوگا اور اللہ کے ہاں اس کی اسے جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس پر قرض دار کا یہ سوچنا، حدیث کی روح کے منافی ہے کہ وہ قرض کی فکر کئے بغیر مغفرت عامہ کی توقع پر جہاد میں شریک ہوگا اور جان دے گا۔

علامہ ابن رشد کہتے ہیں کہ اہل علم کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ جہاد میں شرکت کے لئے قرض خواہ کی اجازت ہونی چاہئے یا نہیں؟ جمہور نے اجازت کے بغیر شرکت کو جائز قرار دیا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ ادائیگی قرض کے لئے کوئی چیز چھوڑ جائے۔^۱

لیکن یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ اس میں فقہاء کے نقطہ نظر کی ٹھیک سے ترجمانی نہیں ہو سکی ہے۔ قرض دینے والے اور قرض دار کے سلسلے میں فقہاء نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ذیل میں کسی قدر اختصار سے اسے پیش کیا جا رہا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ جس شخص پر قرض ہو، چاہے وہ فوری طور پر واجب الادا نہ ہو، بلکہ اس میں تاخیر ہو سکتی ہو تو اس کے لئے دائن (قرض دینے والے) کی اجازت کے بغیر جہاد پر جانا جائز نہیں ہے۔ لایہ کہ وہ اس کی ادائیگی کا انتظام کر جائے یا اس کے لئے کوئی کفیل مقرر کر دے، یا اس کے لئے کوئی چیز رہن رکھ دے۔ یہی امام شافعی کی رائے ہے۔ لیکن امام مالکؒ نے اس شخص کو جنگ میں شرکت کی اجازت دی ہے جو اپنا قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ اس لئے کہ غیر مستطیع شخص سے فوری طور پر قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں ہوتا اور نہ اس وجہ سے اسے قید کیا جائے گا، اس لئے قرض نہ

۱ ابن رشد: بدلیۃ المجتہد، ۳/۴۱۰، دار الکتب العلمیۃ، لبنان، ۱۹۹۶ء

ادا کرنے پر جنگ سے اسے روکنا صحیح نہیں ہے۔ گویا اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جس کے اوپر کوئی قرض نہیں ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جہاد اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی جان دے اور شہادت حاصل کرے لیکن یہاں اس سے ایک حق ضائع ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے احادیث میں آتا ہے کہ جہاد سے قرض کے علاوہ اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ہاں اگر جہاد فرض ہو جائے تو اس کا حکم دوسرا ہے۔ لہذا اگر وہ ادائیگی قرض کے لئے کوئی چیز چھوڑ جائے، یا اس کے لئے کوئی کفیل مقرر کر جائے تو وہ بلا اجازت جنگ کے لئے جاسکتا ہے۔ امام احمدؒ نے اس کی صراحت کی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے والد، عبد اللہ بن حرامؓ جنگ احد میں شہید ہو گئے ان پر بہت سارا قرض تھا، ان کی طرف سے ان کے بیٹے حضرت جابرؓ نے قرض ادا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات تھی، لیکن آپؐ نے ان کی کوئی مذمت نہیں کی، بلکہ ان کی مدح فرمائی اور فرمایا: فرشتے اپنے پروں سے انہیں سایہ کیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ نوحے کی آواز نے فرشتوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ حضرت جابرؓ سے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کو زندہ کیا اور براہ راست بات کی۔^۱

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ قرض دار، دائن یعنی قرض دینے والے، کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہیں جائے گا اگر قرض فوری طور پر واجب الادا ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے موقف میں نہ ہو، اس لیے کہ اس کے ساتھ دائن کا حق وابستہ ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دائن جہاد میں شرکت کی اجازت تو دے مگر

۱۔ ابن قدامة، المغنی، ۱۳/۲۸، عبد اللہ بن حرامؓ سے متعلق اس حدیث کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری: کتاب الجہاد، باب ظل الملائكة علی الشہید۔ مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل عبد اللہ بن حرامؓ۔

قرض معاف نہ کرے۔ ایسی صورت میں قرض دار کا اپنی جگہ رہنا (جہاد پر نہ جانا) مستحب ہے، تاکہ وہ قرض ادا کر سکے۔ اس لیے کہ قرض کا ادا کرنا زیادہ اہم ہے اسے مقدم رکھنا چاہیے، لیکن اگر وہ دائن کی اجازت سے جہاد پر چلا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ دائن (قرض دینے والا) موجود نہ ہو اور قرض دار یہ وصیت کر دے کہ اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کا قرض ادا کر دیا جائے اور اس کا انتظام بھی عملاً ہو تو جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر ادائیگی قرض کا انتظام نہ ہو تو بہتر ہے کہ وہ جہاد پر نہ جائے۔ اس کے لیے اپنی جگہ قیام اولیٰ ہے، تاکہ بروقت قرض ادا کر سکے۔ لیکن اگر قرض مؤجل ہو، یعنی فوری ادائیگی ضروری نہ ہو تو قرض دار جہاد پر جاسکتا ہے بشرطے کہ بظاہر حالات اس بات کا امکان ہو کہ قرض کی ادائیگی کے وقت سے پہلے واپس آجائے گا۔

قرض کے حکم میں دوسرے حقوق العباد بھی ہیں

اوپر جو احادیث گزری ہیں، ان میں صراحت ہے کہ شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، البتہ اس کے ذمے قرض ہو تو وہ معاف نہ ہوگا۔ قرض انسانوں کے حقوق میں ایک نمایاں حق ہے، اس پر دوسرے حقوق کو بآسانی قیاس کیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ جہاد میں شرکت اور شہادت سے انسانوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔ شرکت سے پہلے ان حقوق و واجبات سے سبک دوش ہونا یا اس کا نظم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی حضرت ابو قتادہؓ کی روایت کے ذیل میں امام نووی لکھتے ہیں:

قوله صلى الله عليه وآله وسلم الا الدين، ففيه
آپ کا یہ فرمان کہ قرض کے علاوہ
سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس

ابن عابدین: رد المحتار مع در المختار، ۶/۲۰۴۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۴ء

میں انسانوں کے حقوق کے سلسلے میں
خبردار کیا گیا ہے کہ جہاد اور شہادت
وغیرہ نیک اعمال انسانوں کے حقوق
کا کفارہ نہیں بنتے۔ اس سے بس اللہ
کے حقوق معاف ہوں گے۔

التنبیہ علی جمیع
حقوق الآدمیین أن
الجهاد والشهادة و
غیرهما من أعمال البر
لا یکفر حقوق الآدمیین
و إنما یکفر حقوق الله ۱
علامہ شوکانی کہتے ہیں:

قرض ہی کے حکم میں انسان کا جو بھی
حق ہے وہ آتا ہے، خواہ اس کا تعلق
جان سے ہو یا عزت و آبرو سے۔ اس
لئے کہ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ
ان سب کا تعلق آدمی کے حق سے
ہے۔ وہ اس کے ساقط کرنے ہی سے
ساقط ہوں گے۔

و يلحق بالدين ما كان
حقا لآدمی من دم او
عرض بجامع ان کل
واحد حق لآدمی يتوقف
سقوطه علی اسقاطه ۲

علامہ تورپشتی کا بیان اور زیادہ واضح ہے۔ فرماتے ہیں:

دین (قرض) سے آپ کی مراد
مسلمانوں (اسی طرح غیر مسلموں)
کے حقوق ہیں جو اس کے ذمے ہیں۔
اس لئے کہ قرض دار وعید کا اور اس
سے مطالبہ کا اتنا مستحق نہیں ہے جتنا
مستحق کہ ایک قاتل، غاصب اور

اراد بالدين هنا ما يتعلق
بذمته من حقوق
المسلمين اذ ليس الدائن
احق بالوعيد والمطالبة
منه من الجاني
والغاصب والخائن

انودى: شرح مسلم، المجلد السابع، الجزء الثالث عشر، ص ۲۷، دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۵ء

۲ شوکانی: نیل الاوطار ۷/۲۵۲

والسارق ۱۔ خائن ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت میں ’دین‘ کی جگہ ’امانت‘ کا لفظ آیا ہے جو زیادہ وسیع المعنی ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

القتل فی سبیل اللہ یکفر الذنوب کلھا الا الامانة والامانة فی الصلوة والامانة فی الصوم والامانة فی الحدیث واشد ذلک الودائع ۲۔
 اللہ کے راستے میں قتل ہونا تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے سوائے امانت کے۔ امانت نماز میں، امانت روزے میں اور امانت گفتگو میں۔ ان میں سب سے مشکل وہ امانتیں ہیں جو کسی کے پاس رکھی جاتی ہیں۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آدمی پر دوسروں کے حقوق ہوں تو جہاد سے پہلے اسے ان کے ادا کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔ انہیں نظر انداز کر کے جہاد میں شرکت صحیح نہ ہوگی۔ شہادت سے بھی یہ معاف نہ ہوں گے۔

جہاد سے پہلے دعوت ضروری ہے

جہاد سے پہلے اسلام کی دعوت ضروری ہے، تاکہ جس قوم سے جہاد کیا جائے اسے معلوم ہو کہ اسلام کیا ہے، وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی جنگ یا جہاد کی کیا بنیاد ہے اور وہ کیوں جنگ کر رہا ہے؟ اس کے بغیر اسلامی ریاست کے لئے کسی ملک کے خلاف تلوار اٹھانے کا جواز نہیں ہے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کسی بھی نافرمان اور غلط کار قوم

۱۔ ملا علی قاری: مرقاة المفاتیح، ۷/۳۷۱

۲۔ رواہ الطبرانی وابو نعیم باسناد صحیح، التیسیر بشرح الجامع الصغیر للمناوی: ۲/۲۰۱، طبع مصر، ۱۴۸۶ھ

پر اس کا عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے جب اللہ کا رسول اس پر دین حق پوری طرح واضح کر دیتا ہے اور وہ حق کے اچھی طرح واضح ہونے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن مجید میں متعدد مواقع پر بیان ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝ (الاسراء: ۱۵)

ہم (کبھی) عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول نہ بھیجیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ۝ ذِكْرَىٰ وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝

ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ اس کے پاس ڈرانے والے نصیحت کے لئے بھیجے۔ اور ہم ظالم نہیں ہیں۔

(الشعراء: ۲۰۸-۲۰۹)

سورہ قصص میں ارشاد ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهِمْ رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ۝ (القصص: ۵۹)

تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان میں کی مرکزی بستی میں رسول نہ بھیجے، جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے۔ ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے مگر اس وقت جب کہ ان کے لوگ ظالم ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روم و فارس یا جن ممالک سے بھی جنگ کرنی پڑی پہلے آپؐ نے انہیں اسلام کی باقاعدہ دعوت دی، اس کے لئے خطوط لکھے، پھر ان سے جنگ ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے۔

ما قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومًا حتى

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم سے جنگ نہیں کی جب تک کہ

یدعوہم ۱۔ اسے دعوت نہ دی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔

ما قاتل رسول اللہ صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم اللہ علیہ وسلم کو ماقط سے کبھی جنگ نہیں کی مگر اسی وقت الادعاهم ۲۔ جب کہ انہیں دعوت دی۔

فروہ بن مسیک المرادی بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری قوم کے جو لوگ اسلام کی طرف پیش قدمی کریں انہیں ساتھ لے کر کیا ان لوگوں سے جو اسلام سے روگردانی کریں جنگ کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں! جب میں واپس ہونے لگا تو آپ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا:

لا تقا تلہم حتی تدعوہم ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ تم الی الاسلام ۳۔ انہیں اسلام کی دعوت نہ دو۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت دینا ضروری نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو مصطلق پر اچانک حملہ کیا۔ ان کو پہلے سے اس کی اطلاع نہیں تھی ۴۔

۱۔ مسند احمد: ۱/۳۸۳۔ دارمی: کتاب السیر، باب فی الدعوة الی الاسلام قبل القتال۔ یہ

حدیث طبرانی، ابویعلیٰ اور مستدرک حاکم میں بھی آئی ہے۔ نیل الاوطار: ۷/۲۶۲

۲۔ مسند احمد: ۱/۳۹۰

۳۔ رواہ احمد۔ البوداؤد والترندی وحسنہ، نیل الاوطار: ۷/۲۶۳، اس موضوع سے متعلق

روایات کے لئے ملاحظہ ہو۔ زیلعی: نصب الراية، تخریج احادیث الہدایة مع الہدایة

۳/۵۸۱، دارالکتب العلمیة، بیروت ۱۹۹۶ء

۴۔ بخاری: کتاب العقیق، باب من ملک من العرب رقیقاً۔ مسلم: کتاب الجہاد، باب

جواز الاغارة علی الکفار الخ۔

امام نووی فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں فقہاء کے تین مسلک ہیں: ایک یہ کہ جنگ سے پہلے انذار ہر حال میں ضروری ہے۔ یہ امام مالک وغیرہ کا مسلک ہے، لیکن یہ کم زور ہے۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ جنگ کے لئے انذار کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ یہ پہلے سے بھی کم زور بلکہ باطل ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ جس قوم سے جنگ ہو، اگر اس تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی ہے تو دعوت کا پہونچانا لازم ہے۔ اگر دعوت پہونچ چکی ہے تو واجب نہیں ہے، البتہ پسندیدہ ہے۔ یہی مسلک صحیح ہے۔ یہ حضرت نافع، حسن بصری، ثوری، لیث بن سعد، امام شافعی، ابو ثور، ابن المنذر اور جمہور کی رائے ہے۔ احادیث صحیحہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان میں بنو المصطلق سے متعلق روایت بھی ہے۔ (یعنی وہ پہلے اسلام سے واقف تھے) ۱۔

علامہ شوکانی نے بھی فقہاء کے مسلک کی تقریباً یہی تفصیل پیش کی ہے اور آخری مسلک کو رائج قرار دیا ہے۔ ۲۔

علامہ ابن رشد فقہاء کے خیالات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جہاد کی شرط بالاتفاق یہ ہے کہ جس قوم سے جہاد ہو پہلے اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول وَمَا كُنَّا مَعْدِيْن حَتَّىٰ نُبْعَثَ رَسُوْلًا، ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کسی قوم سے ایک سے زائد بار جنگ ہو تو کیا ہر مرتبہ اسے اسلام کی دعوت دی جائے گی یا نہیں؟ بعض حضرات نے ہر مرتبہ دعوت کو واجب قرار دیا ہے اور بعض نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ ہر

۱۔ نووی: شرح مسلم، جلد ۶، جز ۱۲، ص ۳۳، دار الکتب العلمیہ، لبنان۔ ۱۹۹۵ء
۲۔ شوکانی: نیل الاوطار ۷/۲۶۲،

باردعوت پیش کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ واجب ہے اور نہ مستحب۔^۱
اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امر میں تو فقہاء کا قریب قریب اتفاق ہے
کہ جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت لازماً دی جائے گی۔ البتہ اس میں اختلاف
ہے کہ جس قوم تک اسلام کا پیغام ایک مرتبہ پہنچ چکا ہے، اس سے جب بھی جنگ
ہو، ہر مرتبہ اس کے سامنے اسلام کا پیش کرنا ضروری ہے یا نہیں؟
فقہاء احناف کے ہاں اس موضوع پر خاصی تفصیل سے بحث ملتی ہے۔
امام کا شانی کہتے ہیں۔

جنگ میں دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام کا پیغام اس
تک پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں پہنچا ہے تو پہلے یہ پہنچانا ہوگا۔ اسلام کی دعوت سے
پہلے جنگ جائز نہ ہوگی۔^۲

علامہ ابن الہمام کہتے ہیں کہ جس قوم سے جنگ ہو اسے معلوم ہونا
چاہئے کہ یہ جنگ لوٹ مار، یا ان کو اور ان کے بال بچوں کو غلام بنانے کے لئے
نہیں ہو رہی ہے۔ (بلکہ یہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہے) اس کا ذریعہ دعوت ہی
ہے۔ اس سے ہو سکتا ہے اسلام ان کے لئے قابل قبول ہو جائے اور جنگ کی
نوبت ہی نہ آئے۔ اس لئے پہلے دین حق کا واضح کر دینا ضروری ہے۔^۳

ایک مسئلہ یہ بھی فقہاء کے سامنے رہا ہے کہ اگر کسی قوم کی طرف سے
اسلامی ریاست پر اچانک حملے کا اندیشہ ہو تو کیا اس صورت میں بھی اسلام کی
دعوت دینے کے بعد ہی اس کے خلاف فوجی کارروائی درست قرار پائے گی، یا
اس کے بغیر بھی اس کا جواز ہے؟ فقہاء نے کہا ہے کہ اس صورت میں بغیر دعوت

۱ ابن رشد: بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ۳/۴۳۳، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۶ء

۲ کا شانی، بدائع الصنائع ۷/۱۳۸

۳ ابن الہمام: فتح القدیر ۵/۴۲۹، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۵ء

کے بھی اسلامی ریاست جنگی اقدام کر سکتی ہے۔ چنانچہ ابن ہمام اوپر کی بحث ہی کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اگر کسی قوم سے اس بات کا اندیشہ ہو کہ دعوت دینے اور اس کا رد عمل جاننے میں جو وقت صرف ہوگا، اس میں وہ تیاری کر کے ریاست پر حملہ کر دے گی تو دعوت دیے بغیر بھی اس کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ ۱۔

علامہ ابن عابدین نے بھی اختصار کے ساتھ یہی بات کہی ہے کہ کسی غیر اسلامی ریاست کا محاصرہ ہو تو حملہ سے پہلے اسے اسلام کی دعوت دینی چاہئے۔ اگر اس تک دعوت پہنچ چکی ہے تو ایسا کرنا مندوب اور پسندیدہ ہوگا اور اگر دعوت نہیں پہنچی ہے تو واجب ہوگا، بشرطے کہ اس سے کوئی ضرر نہ پہنچے۔ (مطلب یہ کہ دعوتی عمل میں ریاست کو ضرر پہنچنے کا خطرہ ہو تو بغیر دعوت کے بھی جنگی کارروائی کی جاسکتی ہے) اس کے بعد علامہ ابن ہمام کی رائے نقل کر دی ہے۔ ۲۔

جنگ سے پہلے دعوت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جس قوم کو دعوت دی جائے، ایک خاص وقت تک اس کا رد عمل دیکھا جائے۔ اس کا منفی رد عمل سامنے آنے پر اس سے جنگ کی جائے۔ دوسری صورت یہ کہ دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی ہوں اور اسی حال میں اسلامی فوج کی طرف سے فریق مخالف کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ یہ نازک ترین حالات میں اسلام کی دعوت ہوگی۔ دونوں ہی صورتیں حسب موقع اختیار کی جاسکتی ہیں اور غالباً اختیار بھی کی گئیں۔

جن قوموں کو جنگ سے پہلے دعوت دی گئی، ان کے سامنے تین صورتیں رکھی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ ان کے حقوق اور

۱۔ ابن الہمام، فتح القدیر: ۵/۴۲۹، دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۵ء

۲۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۶/۲۰۷-۲۰۸

جہاد کے بعض احکام

ذمے داریاں وہی ہوں گی جو دوسرے مسلمانوں کی ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ عرب کے قبائل سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ان کا شمار مہاجرین میں ہوگا۔ مہاجرین ہی کی طرح ان سے معاملہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اپنے علاقے ہی میں رہنا چاہیں تو جہاد میں ان کی شرکت نہ ہو سکے گی اور مال غنیمت میں ان کا حصہ نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ کہ اگر اسلام قبول نہ کریں تو اسلامی اقتدار کو تسلیم کریں اور جزیہ ادا کریں۔ تیسری صورت یہ کہ اگر وہ ان دونوں باتوں کو رد کر دیتے ہیں تو ان سے جنگ ہوگی۔

صحیح مسلم اور صحاح کی بعض دوسری کتابوں کی روایت ہے۔ سلیمان بن بریدہ اپنے والد حضرت بریدہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی لشکر بھیجتے تو امیر لشکر کو تقویٰ کی اور مسلمانوں کے ساتھ خیر اور بھلائی کا رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرماتے، جنگ میں انہیں اخلاقی حدود کا پابند رہنے کا حکم دیتے، اس کے بعد ارشاد ہوتا۔

و اذالقیتم عدوک من
المشرکین فادعہم الی
ثلاث خصال فایتھن ما
اجابوک فاقبل منهم و
کف عنہم ثم ادعہم الی
التحول من دارہم الی
دار المہاجرین و اخبرہم
انہم ان فعلوا ذلک فلہم
مال المہاجرین و علیہم
ما علی المہاجرین فان
ابوا ان يتحولوا منها

جب تمہارا سامنا مشرک دشمنوں سے ہو تو انہیں تین باتوں کی دعوت دو۔ ان میں سے جس بات کو بھی وہ اپنے لئے پسند کریں تم اسے قبول کر لو اور جنگ سے باز آ جاؤ۔ (پہلے) انہیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اسے اختیار کر لیں تو تم اسے تسلیم کر لو اور ان سے جنگ سے باز رہو۔ پھر اس بات کی دعوت دو کہ وہ اپنے علاقے سے دار المہاجرین (مدینہ) منتقل ہو جائیں۔ انہیں بتاؤ اگر وہ ہجرت کر

جائیں تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں۔ اور وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مہاجرین کی ہیں۔ اگر وہ ہجرت کے لئے تیار نہ ہوں تو انہیں بتاؤ کہ ان کی حیثیت اعراب مسلمین کی ہوگی جن پر اللہ کے احکام جاری ہوں گے جو تمام مسلمانوں پر جاری ہوتے ہیں۔ لیکن غنیمت اور فی میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔ اگر وہ اس سے انکار کر دیں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ اگر وہ اس کے لئے تیار ہو جائیں تو اسے قبول کرلو۔ اور ان سے جنگ سے باز رہو۔ لیکن وہ اگر اس کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب کرو اور ان سے جنگ کرو۔

ہجرت کا حکم فتح مکہ سے پہلے تھا۔ جزیہ کا تعلق اہل کتاب اور غیر عرب مشرکین سے ہے۔ یہاں صرف مشرکین کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے اہل کتاب کو ان

فاخبرهم انهم يکونون
کاعراب المسلمين
يجرى عليهم حکم الله
الذى يجرى على
المومنين و لا يكون لهم
فى الغنيمه و الفى شىئى
الا ان يجاهدوا مع
المسلمين فان ابوا
فسلهم الجزية فان هم
اجابوك فاقبل منهم و
کف عنهم فان ابوا
فاستعن بالله و قاتلهم۔

۱۔ مسلم، کتاب الجہاد والسير، باب تأمیر الامراء علی البعث الخ۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین۔ ترمذی، کتاب السیر، باب ما جاء فی وصیته فی القتال۔

جہاد کے بعض احکام

کے بعض عقائد کی بنا پر مشرکین ہی کے ذیل میں شمار کیا گیا ہو۔ اس بحث میں دعوت، جزیہ اور جہاد کی جو ترتیب بیان ہوئی ہے اس پر علماء کا اتفاق ہے۔

فقہ مالکی کی کتاب 'الشرح الصغیر' میں کہا گیا ہے کہ جہاد سے پہلے اسلامی فوج فریق مخالف کو اسلام کی دعوت دے گی۔ چاہے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اس سے قبل پہنچ ہی چکا ہو۔ ایک رائے یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اسی صورت میں دی جائے گی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس تک نہ پہنچی ہو۔ دعوت سے پیشتر ہی فریق مخالف خود سے جنگ شروع کر دے تو اسلامی فوج جوابی کارروائی کرے گی۔ دعوت کے نتیجے میں اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اپنی جگہ امان میں رہے گی۔ اگر دعوت کا انکار کر دے تو اس سے جزیہ کا مطالبہ ہوگا۔ اس کے لئے وہ تیار ہو جائے تو جنگ نہیں ہوگی۔ جزیہ کے لئے بھی وہ تیار نہ ہو تو اس صورت میں اس سے جنگ کی جائے گی۔^۱

دور اول کی صورت حال کے پیش نظر بعض علماء نے کہا ہے کہ آج اسلام سے کون واقف نہیں ہے۔ وہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا پیغام اور اس کے مقاصد جنگ معلوم و معروف ہیں۔ یہ دعوت دینے ہی کے ہم معنی ہے۔ امام احمد بن حنبل اسی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اسلام کی دعوت سب ہی لوگوں تک پہنچ چکی اور عام ہو چکی ہے۔ میرے علم میں اب کوئی نہیں ہے جو اسلام سے ناواقف ہو، اس لئے جنگ سے پہلے دعوت کا دینا ابتداء اسلام میں تو ضروری تھا۔ اب نہیں رہا۔

اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ روم اور فارس

۱۔ احمد الدردیر، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک مع حاشیہ الصادی: ۲/۲۷۵،

دارالمعارف، مصر۔ ۱۳۹۲ھ، فقہی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، ابن قدامہ، المغنی:

کی سرحدوں سے آگے ایسے لوگ ہیں جن تک دعوت نہیں پہنچی ہے، تو دعوت دینا ضروری ہوگا۔ اس سے قبل ان سے جنگ صحیح نہ ہوگی۔ اگر کسی قوم کو دعوت پہنچ چکی ہے تو از سر نو دعوت دینا بہر حال مستحب اور پسندیدہ ہے۔ ۱۔

ساتویں صدی کے معروف حنفی فقیہ علامہ ابن الہمام کے نزدیک گو اسلام کا تعارف وسیع پیمانہ پر ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی دعوت ساری دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ دنیا میں ایسے ممالک اور افراد بھی ہیں جنہیں اس کا شعور ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ ان تک دعوت نہیں پہنچی ہے۔ ہاں! اگر ان کو دعوت پہنچ چکی ہے تو انہیں دعوت دینا واجب نہ ہوگا، بلکہ استحب کے حکم میں ہوگا۔ ۲۔

امام مالک کے ہاں یہ بات زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں، اسلامی ریاست سے قریب کی ریاست سے تو جنگ بغیر دعوت کے ہو سکتی ہے، اس لئے کہ اسلام پھیل چکا ہے۔ قریب کے لوگ اس سے ناواقف نہیں ہیں لیکن جو لوگ دور کی ریاستوں میں ہیں۔ (ان کا اسلام سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے) اس لئے انہیں دعوت دینی ہوگی یہ اسلام اور جہاد کے بارے میں شکوک و شبہات کو ختم کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ ۳۔

ان تفصیلات سے یہ بات قطعیت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کے لئے ضروری ہے کہ کسی غیر اسلامی ریاست سے جنگ سے پہلے اسے اسلام کی دعوت دے۔ اس کے بغیر اس کے خلاف فوجی اقدام صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر اسلامی ریاست پر کوئی غیر اسلامی ریاست حملہ آور ہو، یا اس کے حملہ کا شدید اندیشہ ہو تو اسے اپنے دفاع کا حق ضرور حاصل ہوگا۔

۱۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/۲۹

۲۔ ابن الہمام، فتح القدیر: ۵۰/۲۲۹

۳۔ ابن حجر فتح الباری: ۶/۲۰۹

سربراہان مملکت کو رسول اللہ کے مکاتیب کی نوعیت

اب آئیے اس سوال پر غور کیا جائے کہ کسی غیر اسلامی ملک کو دعوتِ اسلام کا مطلب کیا ہے؟ ایک خیال یہ ہے کہ مدعو قوم سے صرف یہ معلوم کیا جائے گا کہ وہ اسلام یا جزیے میں سے کس چیز کو اختیار کرے گی؟ ان دونوں میں سے کسی کو وہ قبول نہ کرے تو اس سے جنگ ہوگی۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سربراہان ممالک کو جو مکاتیب ارسال فرمائے ان سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں ان مکاتیب کے مضمون سے بحث نہیں ہے۔ صرف ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا پیش نظر ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ مکاتیب ارسال فرمائے تھے، یا اسلامی فوج کو یہ ہدایات دی تھیں، اس وقت اسلامی ریاست عملاً موجود تھی۔ آپ اس کے سربراہ تھے۔ آپ نے اسی حیثیت میں یہ خطوط روانہ فرمائے تھے۔ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اسلام غیر متعارف نہیں تھا بلکہ اس کا وسیع تعارف ہو چکا تھا۔ بہت سی قومیں اور قبائل عرب اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ اسی بنیاد پر ان سے کشمکش جاری تھی۔ جو قومیں تفصیل سے اسلام سے واقف نہیں تھیں وہ آسانی سے اسے سمجھ سکتی تھیں۔

کسی ریاست کا وجود بذات خود اس کے نظریات کے تعارف کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے، اس کے لئے لمبے دعوتی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امریکہ اور مغربی ملکوں کا وجود اور ان کا نظام حکومت خود ظاہر کرتا ہے کہ وہ جمہوریت اور سرمایہ داری کی بنیاد پر قائم اور اس کے علم بردار ہیں۔ کمیونزم اور اس کے اصول و نظریات کو کمیونسٹ ممالک اور ان کے نظام حکومت کے ذریعہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جمہوری ممالک جمہوریت کی یا کمیونسٹ ممالک کمیونزم کی دعوت دیتے ہیں تو ان کے پیچھے، پوری ریاست ہوتی ہے۔ انہیں اپنی بات سمجھانے کے

لئے اس طرح دلائل کی ضرورت نہیں پیش آتی جس طرح کسی ایسے نظریہ کے سلسلہ میں پیش آتی ہے جس کے پیچھے کوئی اقتدار یا ریاست نہ ہو۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ کے قریب مسلم ممالک ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے حقیقی معنی میں اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے، کیا وہاں اسلام اس طرح جاری و ساری ہے کہ اسے دیکھ کر اسلام کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جاسکے؟ پھر کیا ان میں سے کسی ملک نے دور و نزدیک کے کسی غیر مسلم ملک پر اسلام کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جہاد کا تذکرہ تو ہے لیکن جہاد کے لئے جو شرط لازم ہے وہ پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔

مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک اہم تصنیف

اسلام میں خدمت خلق کا تصور

○ خدمتِ خلق کا صحیح تصور ○ غلط تصورات کی تردید ○ خدمتِ خلق کا اجر و ثواب ○ خدمتِ عبادت ہے ○ خدمتِ سب کی کی جائے ○ خدمت کے مستحقین ○ وقتی خدمات ○ مشکلات کا مستقل حل ضروری ہے ○ رفائی خدمات ○ خدمت کے لیے انفرادی و اجتماعی جدوجہد موجودہ دور میں خدمت کے تقاضے اور ان پر عمل کی شکلیں ○ خدمت کے ساتھ اخلاص ضروری ہے۔

مصنف کے جاندار قلم نے ان تمام گوشوں کو نکھار دیا ہے۔

صفحات: ۱۷۶
وقت کے اہم موضوع پر اس پہلی مستند کتاب کا انگریزی، ہندی اور تمل ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔
انگریزی ترجمہ کا عنوان ہے:

THE CONCEPT OF SOCIAL SERVICE IN ISLAM

قیمت: ۵۰ روپے

صفحات: ۱۶۵

اور ہندی ترجمہ ہے:

जन सेवा और इस्लाम

قیمت: ۳۰ روپے

صفحات: ۱۱۹

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

ملنے کا پتہ:

دعوتِ مگر، ابو الفضل انکلیو، جامعہ مگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵